HARF-O-SUKHAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.3 2023

تبسم کاشمیری کی نظم میں عصری شعور

Tabassum Kashmiri's Contemporary Sense in his Poems

ڈاکٹر احمد حسین ہادی

ہوسٹن (امریکہ)

ڈاکٹر شائلہ سلیمان

شعبۂ اُردو، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر فرید حسینی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف چکوال، چکوال

Abstract

Tabassum Kashmiri is a well-known literary personality. He is a multi-dimensional person, i.e. scholar, teacher, critic etc. but his primary or dominant shade is poetry. At present he considered as an authentic poet in both form i.e. Ghazal & Nazam. His poetry addressed socio-political content beside the individual feelings, emotions and dreams. The poems narrate the contemporary situation with the support of artistic sense. The poet kept in mind the ground realities of his homeland & the global challenges while his creative work. In this article efforts have been made to explore the "Contemporary Sense" in his poems.-

Key Words. *Ghazal, Civilization, Contemporary, Century, situation, global, challenges*

غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔ خیال کی ندرت، خیال آفرینی اور دلکش اندازِ بیاں کے ساتھ حسن و عشق کے مضامین اسے آرٹ کی اعلیٰ مسند فراہم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ چُست بندش، دلفریب تغزل اور ردھم وہ خواص ہیں جو اسے دوسری اصناف سے ممیز کرتی ہیں۔ غزل مشرقی تہذیبی روایت میں گُندھی ہوئی ہے لہٰذا اس کی ارضی پیوستگی مستحکم ہے۔ اس کی خوش نصیبی ہے کہ ابتداء ہی سے اسے خلاق فن کار میسر ہوئے جن میں ولی دکنی، آبرو اور آرزو جیسے قد آور اساتذہ سخن شامل ہیں۔ دوسرے دور میں جو متقدمین بطور غزل گو سامنے آئے انہوں نے اسے کلاسیک کے درجے پر فائز کر دیا۔ میر تقی میر، خواجہ میر درد اور مرزا محمد رفیع سودا نے اردو غزل کو فنی لحاظ سے ثروت مند کیا ان نابغۂ روز گار ہستیوں کی فراہم کردہ بنیادوں پر مرزا غالب، مومن، آتش اور ناسخ وغیرہ نے شاندار عمارت تعمیر دی۔ ان فنکاروں نے غزل کے جو معیارات قائم کیے وہ آنے والے شعراء کے لیے گویا مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔ جدید شاعری اور نظم کی ہماہمی کی آندھیوں کے باوجود غزل نے اپنے وجود کو بر قرار رکھا۔ بیسویں صدی میں داغ دہلوی کے بعد حسرت موہانی، عبد الحمید عدم، ناصر کاظمی، شہرت بخاری، ساغر صدیقی، وغیرہ جیسے تخلیق کاروں نے روایتی صنف کے علم کو سربلند رکھا اور عہدِ حاضر کے کئی شعراء نے اس کو حرزِ جاں بنا رکھا ہے۔ انہی میں ایک نام تبسم کاشمیری کا بھی ہے۔

تبسم کاشمیری ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل فن کار ہیں۔ جنھوں نے اردو ادب کی کئی اصناف میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ تخلیقی و تحقیقی میدانوں میں انھوں نے اپنا لوہا منوایا ہے۔ ان کی بنیادی اور طاقتور جہت ان کی شاعری ہے۔ زیر نظر مضمون میں ان کی نظموں

حرف و سخن
HARF-O-SUKHAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.3 2023

پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ تبسم کی شعر گوئی کا آغاز اور وطن عزیز میں پہلا مارشل لاء ایک ہی سال وقوع پزیر ہوئے۔ آزادی کے بعد جن آدرشوں، خوابوں نے منزل کا روپ دھارنا تھا وہ سراب ثابت ہوئے تو عام آدمی کے دکھوں میں اضافہ ہوا۔ تبسم کاشمیری کی اس دور کی نظموں میں انفرادی احساس شکست، شخصی مایوسی اور احساس زیاں نمایاں ہیں۔ رومانیت کے پردے میں ملفوف شاعر کا کرب اولین مجموعہ "تمثال" کا بنیادی نکتہ ہے۔ ذاتی غم کو اجتماعی رنج میں مدغم کرنا انھیں ناصر کاظمی اور میر تقی میر سے موازنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سماج کی بنت میں دراڑ نے فرد کی شناخت کو ہمیشہ چیلنج کیا ہے۔ برصغیر کی سرزمین پر یہ تجربہ بہت مرتبہ دہرایا گیا۔ جغرافیے، عقائد، نظریات، روایات، تہذیب پر حملے ہوں یا سائنس، جدت، صنعت و حرفت اور سیاست کے گھن چکر یہ سب عام آدمی کے لیے وبال ثابت ہوئے ہیں۔ اس کی زیست میں کوئی سُکھ کا لمحہ نہیں آسکا۔ یہ سب کیوں ہوا، اس کے ذمہ دار کون ہیں، کیسے ہوا، انت اس کا کیا ہوگا، کالی رات کب ڈھلے گی، امن و خوشحالی کا سورج کب طلوع ہوگا؟ یہ سب سوالات تبسم کاشمیری کی نظموں میں اٹھائے گئے ہیں۔

"ہماری خواہش کا چاند کیسے چمک رہا ہے۔۔۔ یہ کونسے نقش بن رہے ہیں۔۔۔ میں بن رہا ہوں، میں مٹ رہا ہوں"۔(اعصاب کی چرچراہٹ) عصر حاضر کا شعور کسی بھی فنکار کا طرہ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ جس کی بدولت وہ معاشرے کی ناہمواریوں اور کجیوں کو شعری قالب عطا کرتا ہے۔ جبر اور گھٹن کے ماحول میں شاعر کی نوائے دلگداز ہی وہ واحد سہارا ہوتی ہے جو جینے کی امید دلاتی ہے۔

"میں یاد کرتا ہوں۔۔۔ بہار کے میٹھے شہتوتوں۔۔۔ گرمیوں کے کھٹے فالسوں۔۔ اور کسیلے جامنوں کا ایک خواب! میں یاد کرتا ہوں تپتی منڈیروں ۔۔ گرم شہ نشینوں ۔۔ اور تنگ گلیوں میں گم ہو جانے والا اپنے بچپن کا ایک خواب!" ڈھونڈتا ہوں ایک خواب! یہ (نصابی) تاریخ ایک نسل پیدا کر رہی ہے جو ذہنی لحاظ سے تنگ نظری، نفرت، عناد اور تعصب و فرقہ وارایت کے جذبات لے کر تعلیمی اداروں سے نکل رہی ہے۔(۱)

ایک ادیب ہی ہے جو اس معاملے میں قوم کو تصویر کا صحیح رخ دکھانے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہے۔ تبسم کاشمیری کے ہاں وہ فکری قوت موجود ہے جو معاصر صورتحال کو تجربے میں سمو کر فنی پیکر میں ڈھال لیتی ہے۔ شعبدہ بازی کی سحر کاری کے نتیجے میں طاری کی گئی نیند میں دیکھے گئے خواب فرد نے بھی دیکھے اور قوم کو بھی دکھائے گئے۔ مندرجہ بالا نظم میں اس تعبیر کی عدم دستیابی کا منظر نامہ آج بھی اپنا اثبات کر رہا ہے۔ نظم نگار کو زبان و بیان پر دسترس حاصل ہے جس کی وجہ سے کلام میں موزونیت کا سوال نہیں اٹھتا۔ وہ لفظ کو پورے لسانی شعور کے ساتھ برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔ زندگی کی تلخیوں کو لفظوں پر حاوی نہیں ہونے دیتے بلکہ غیر محسوس طریقے سے قاری کے شعور پر ایک ٹھوکا دیتے ہیں۔ مثلاً "زمین پہ مرا سفر بہت لمبا تھا۔۔۔ بے نام رستوں، بے نام بستیوں، بے نام گلیوں۔۔۔ اور بے نام انسانوں کے درمیان۔۔۔ ایک لمبا بے نام سفر۔۔۔ گم نام ساحلوں، گم نام جزیروں۔۔ گم نام کشتیوں اور گم نام ملاحوں کے درمیان۔۔۔ ایک بالکل گم نام سفر۔۔۔ ایک نا مختتم سفر "زمین پر یہ سفر اس مسافت کا تسلسل ہے جو آدم کی تقدیر میں لکھا گیا۔ اس نظم کی معنوی تہ داری میں شاعر کا اپنا عہد پہلی تہہ میں نظر آجاتا ہے۔ جھوٹ، منافرت، فریب اور دروغ کی تاریخی حقیقت کو اتنی سہل انگاری کے ساتھ بیان کر دینا نظم نگار کی کامیابی ہے۔ سفر اور مسافر دونوں اصطلاحیں قاری کو کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ آفاقیت اور عصریت کے لیے حدِ فاصل قائم کرنا مشکل

حرف و سخن
HARF-O-SUKHAN
Urdu Research Journal of PAKISTAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.3 2023

ہو جائے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ابلاغ کارگر ہے۔ سماجی اور سیاسی حقیقت نگاری نظم میں برتا تنے ہوئے رسے پر چلنے کے مترادف ہے۔ ذرا سی غفلت فن کو نعرہ بنا دیتی ہے۔ فن کا پہلا مقصد اسے فن رکھنا ہوتا ہے۔ سید عابد علی عابد نے ایک جگہ لکھا ہے:

"فنون لطیفہ کے سلسلے میں ایک روشن دماغ نے یہ بات کہی کہ انسان کی بڑی پہچان یہ ہے کہ بعض کام مادی فائدے کی توقع اور ضرورت کے بغیر بھی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر بانسری بجانا یا کسی منظر کی تصویر کھینچنا یا سروں کی تال میل سے نغمہ پیدا کرنا"۔(۲)

اس معیار پر تبسم کاشمیری کی نظمیں پورا اترتی ہیں۔ پہلی قرات میں وہ ترنم اور نغمگی کا تاثر بھرپور دیتی ہیں:

"نہیں کوئی کمبل جسے اوڑھ لوں۔۔۔ نہیں کوئی خوشبو جسے سونگھ لوں۔۔۔ نہیں کوئی سہایا جسے روک لوں۔۔۔ نہیں کوئی تارہ جسے تھام لوں۔۔ نہیں کوئی چہرہ جسے چوم لوں۔۔۔ نہیں کوئی سپنا جسے دیکھ لوں"۔(تنہائی)

معنوی لحاظ سے یہ نظم کسی کھنڈر پر کھڑے ہوئے درماندہ شاعر کا مرثیہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر آہنگ اور ردھم میں یہ غنایت سے بھرپور گیت کا لطف دیتی ہے۔ کم فہمی اور لاعلمی کے اقرار کے باوجود اس قسم کا تاثر مرزا غالب کے علاوہ شاید ہی کہیں اور ملے۔ معاصر صورتِ واقعہ کا بیان ان نظموں میں پورے تاریخی شعور کے ساتھ موجود ہے۔ اور قاری کے لیے مستقبل کی بازیافت کا پیغام بھی بین اسطور موجود ہے۔ بے تعصبی، مساوات اور احترام آدمیت نظم کے سروکار ہیں جن کی بنیاد پر ہر ظلم اور زیادتی سے نفور کا اظہار ملتا ہے۔

"چاند، چاند کے اندر تھا۔۔ اور ہوا، ہوا کے اندر۔۔ پیڑ پیڑ کے اندر۔۔ اور بیج بیج کے اندر۔۔ اور آدمی۔۔۔؟"۔(کیا آدمی کے اندر آدمی تھا؟)

تخیل اور فکر جتنی بلند ہے لہجہ اتنا ہی دھیما اور ملائم ہے۔ اسلوب میں جمالیاتی پہلو نمایاں رکھ کر انھوں نے فلسفیانہ سوال اٹھائے ہیں۔ اصل میں یہ سوال انھوں نے اپنی قوم سے اپنے سماج سے کئے ہیں مگر مادہ پرستانہ دور میں مٹتی ہوئی روحانی قدروں کے حوالے سے یہ ساری انسانیت سے بھی ہم کلام ہیں۔ تبسم کاشمیری کی شاعری کو محض روایتی نظم کہہ کر مطمئن ہو جانا انصاف نہیں یہ ایک عصری آشوب کی حامل واردات ہے جو ہماری اجتماعی تاریخ بھی بن چکی اور آج بھی جس کا تسلسل جاری ہے۔ تمدن اور کلچر میں اگر فکری جمود اور ذہنی پراگندگی درآئے تو ایسے میں حکماء قوم وملت ہی مدد کو آتے ہیں اور معاشرے مین نئی روح پھونک کر اسکو تعفن زدہ ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ ان کی نظموں میں یہ احساس اجاگر ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمان و مکان سے مخاطب ہیں۔ وطن عزیز کے بیسیوں مسائل میں سے ایک مسئلہ مذہبی انتہا پسندی بھی ہے۔ دین کو مذہب بنا دینے والے کم علم اور کوتاہ اندیش لوگوں نے اسے تنگ نظری کی بھینٹ چڑھا دیا۔ محمد حسین آزاد نے اس بابت فرمایا تھا:"آخر علمائے اسلام کے ہاتھوں یہ خواری ہوئی کہ اسلام اور عام مذہب یکساں ہو گئے۔"(۳)

بین الاقوامی بیانیے کے تزویراتی تقاضوں کے تحت جس طرح کے منظر نامے ابھرے ان میں اسلام چودھویں اور پندرھویں صدی عیسیوی کے (Church Based) محتسب عیسائیت سے مشابہہ لگنے لگا ہے۔ اب تو لوتھر طرز کی تحریک کی ذمہ داری بھی ہمارے ادیبوں کو نبھانی ہے جس میں اس آفاقیت کا پیغام عام کرنا ہے جو دین کا بنیادی مدعا تھا اور ہے۔ کاشمیری صاحب کے ہاں یہ صدا موجود ہے:

"تم شاعری لکھو۔۔۔میں شاعری اگاؤں گا۔۔چاند مرا چراغ ہے۔۔۔اور سورج مری موم بتی ہے۔۔۔میں اندھیرے انسانی جھونپڑی میں۔۔یہ موم بتی ضرور روشن کروں گا"(میں شاعری اگاؤں گا)

روشنی ان کے ہاں استعارہ ہے اور رجائیت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔انسان کے ظاہر و باطن میں بپا امید و بیم کی صورت گری ان نظموں میں ہمیں نظر آتی ہے۔ڈاکٹر صلاح الدین درویش نے لکھا ہے:

"نظم اظہار کا فنکارانہ وسیلہ ہے۔ نظم بطور فن اپنی داخلی ترجیحات میں تصوری، تفہیم یا فکری منطقے کو اہمیت اس لیے دیتی ہے کیونکہ ابلاغ نظم کی بینادی ضرورت ہوتا ہے۔کسی فکری منطقے کے بغیر یہ ابلاغ غیر موثر ہو جاتا ہے۔"(۴)

معاشروں کے مزاج بنانے میں عرصہ دراز کی ریاضت درکار ہوتی ہے اور مزاج کو نظریاتی سطح پر عقیدے میں بدل دینا اس سے بھی آگے کی منزل ہے۔اس راسخیت اور پختگی کو توڑنا اور اس میں ردوبدل کرنا اتنا کٹھن کام ہے کہ پھر صدیوں کی جدوجہد سے ہی یہ مشکل حل ہوتی ہے۔

بقول سید محمد تقی ہمزاد اور نظریوں کی قسمت میں چونکہ یہ لکھا ہے کہ وہ طویل عرصے ذہن کے خانوں میں جم کر بیٹھ چکے ہوں تو پھر بڑی مشکل سے جگہ خالی کرتے ہیں۔(۵)

تبسم کاشمیری نے اپنے وطن کے ان مسائل کو نہ صرف سمجھا ہے بلکہ ان کے پسِ منظر میں جھانکنے کی سعی بھی کی ہے۔"غضب وہ شب تھی "ان کی نظم اس دعوے کی صداقت پر دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔:

-"ہے شکر تیرا خدائے برتر۔۔۔یوں ہی شہادت ہے روزان کی۔۔۔ شہید ہو کر دوبارہ جینا، شہید ہونا۔۔۔ سدا سے ان کا یہی مقدر ۔۔۔شہادتوں کا یہ سلسلہ ہے دراز ایسا نہ ابتداء ہے نہ انتہا ہے"(غضب وہ شب تھی)

یہ اشعار دو آتشنہ معانی کے حامل ہیں۔ظالم مظلوم، قاتل مقتول،ناز و نور، باطل و حق، نہی وامر جہاں گڈ مڈ ہوں وہاں حقائق تک رسائی ذہنِ پختہ کے ذریعے ممکن ہے۔اس نظم میں یہ طے کرنا دشوار ہے کہ یہ قصیدہ ہے یا مرثیہ۔متضاد کیفیات سے معنویت میں جدت نظم نگار کا وصف ہے جس کی جھلک ان کے کئی مصرعوں میں ملتی ہے۔علمی تبحر، حسن بیان، شعری شعور اور دلکش اسلوب کی بدولت تبسم کاشمیری ایک پیکر میں کئی رنگ بکھیرنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔دردمندی ان کے ہمیشہ پیش نظر رہتی ہے۔میاں محمد بخش نے ایسے ہی فنکاروں کے متعلق کہہ رکھا ہے:

دردمنداں دے سخن محمد دین گواہی حالوں

جس کنی پُھل بدھے ہوون آوے باس روما لوں

ترجمہ: اے محمد بخش! دردِ دل رکھنے والوں کے کلام گواہی دے رہے ہوتے ہیں۔کیونکہ جس رومال کے پلو کے ساتھ پھول بندھے ہوں اس سے خوشبو ہی آتی ہے۔

حرف و سخن
HARF-O-SUKHAN
Urdu Research Journal of PAKISTAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.3 2023

نظم نگار کے عہد کا ایک اہم سروکار تعصب(Biasness) ہے جس کو حالیؔ نے جہالت کی پیداوار کہا ہے۔ یہ معاشروں کے لیے سم قاتل ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے انسانیت پھل پھول نہیں سکتی۔ نظموں میں اس طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اس عفریت کو پتھر سے تشبیہ دی گئی ہے:

"یہاں سورج کبھی گردن نکال کر نہیں جھانکتا۔۔۔ دن چوری ہو چکا ہے۔۔۔ رات رہزنوں کے قبضے میں ہے۔۔۔ شام بہ طور تاوان رکھ لی گئی ہے۔۔۔ اور صبح رہن پڑ چکی ہے شائد دن کے گلے میں تعویز باندھ دیا گیا ہے۔۔۔ اور روشنی کے گلے میں طوق۔۔۔ شاید اب کھیتوں میں آگ اُگے گی۔" (ہم نے شعلوں کی پنیری بوئی تھی)

تشبیہات، تراکیب اور استعارے ان کی نظم کو حرکی بناتے ہیں۔ لفظوں کے پیکر تراش کر ان سے حسی ادراک کو متاثر کرنا تبسم کا مشغلہ ہے۔ جدت اور روایت کا رس لیے یہ امیجری ان کی شاعری میں تیکھے رنگوں کا امتزاج ہے مثلاً حرفوں کا آسماں، ساحل کی جلد، خواب کے پر، مغلظ رات، بادبان سے بندھی ہوا، ہانپتی کانپتی صدیاں، جگنوؤں کے ترکش، مکانوں کی متورم چیخیں، خون میں شہر، لڑکھڑاتی رات، چپ کی بارش، لفظوں کی کشتی، جنگل کی آواز، موسمی نیزے، ادھڑے رستے، ننگا مچھیرا، بادلوں کے تھیلے، نظم کی سبزیاں، نظم کا جسم، سوئی صدیاں وغیرہ۔ ایسے جادوئی اثرات کے حامل الفاظ نظم کو دلکش اور پر اسرار بناتے ہیں۔ معانی و مفاہیم کی وہ شدت جو شاعر کی آرزو ہے ان تشبیہات واستعاروں سے کافی حد تک تکمیل پذیر ہو جاتی ہے۔ ڈرامائی اثر آفرینی نظم میں صاحب کمال فن کار ہی پیدا کر سکتا ہے۔ یقیناً یہ استعارے قاری کو جھنجھوڑتے ہیں اور عصر حاضر کے آشوب کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ جہانِ رنگ و بو کی سحر کاری میں کھو جانے سے آگے وہ منزل آتی ہے جو تفکر و تدبر کی متقاضی ہوتی ہے۔ ان نظموں کے اندر موجود اور معلوم مواد کا ابلاغ تو ہے ہی۔ تھوڑی سی شعوری کاوش سے بین السطور نامعلوم حقائق پر سے بھی پردہ سرکتا جاتا ہے:

(۱) "ہر اک شے نقب اپنا الٹے ہوئے ہے۔۔۔ سبھی بھید اپنی زبانیں نکالے، مرے سامنے آ گئے ہیں۔۔۔ کتابوں کے اوراق خود بولتے ہیں۔"(انکار کی سرحد پر)

(۲) "دوپہر کی تپتی دھوپ میں۔۔ خواہشیں اپنا جسم اٹھا کر۔۔ چوبی کھڑکی کے شیشوں سے۔۔ اکثر جھانکتی رہتی ہیں۔" (خواہشیں اور خون)

(۳) "میں کب سے چیختا ہوں درد سے چلاتا بھی پھرتا ہوں۔۔ تشدد، خوف، دہشت، بربریت۔۔ اور مغلظ راتوں کی راتوں میں شہوت۔۔ ایک کالا پھول بُنتی ہے۔"(ندامت ہی ندامت)

ماضی سے قطع نظر تبسم کاشمیری نے اپنے حاضر میں جو مشاہدات کئے جن تجربات سے وہ گزرے، جس قسم کے انفرادی اور ملی حادثات و سانحات کے وہ عینی شاہد ہیں ان سب کو نظم میں سمویا گیا ہے۔ عصری آگہی اور حاضر کا شعور ان کے فن کو انفرادیت بخشتے ہیں۔ وہ معاصرین میں اپنے لہجے اور فکر دونوں کی بنا پر الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ حال کی پہچان پر ہی مستقبل کی صورت گری ممکن ہوتی ہے۔ آنے والی نسلیں یقیناً اپنی تاریخ و تہذیب اور ان کے سروکار تبسم کاشمیری کی نظموں میں پا سکیں گے۔ موجودہ نسل کے لیے شاعر کا ایک اہم پیغام

حرف و سخن
HARF-O-SUKHAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.3 2023

یہ ہے کہ تقلیدی ذہن اور فکری جمود کو ان نظموں میں چیلنج کیا گیا ہے۔ تبسم کاشمیری کی بصیرت و درک کے پیچھے ان کا عصری شعور کارفرما ہے۔ ابھی مسافتیں باقی ہیں۔ گھبرانا نہیں۔ جہد مسلسل ہی میں کامیابی کا راز مضمر ہے:

راستوں میں ابھی بہت برف ہے۔۔۔ بہت سے سمندر اور بہت سے آسمان ہیں۔۔۔ بہت سے سورج، بہت سے سیارے ہیں۔۔۔ سیاہ پیڑ، سیاہ پودے اور سیاہ پھل۔۔۔ (کچھ ان کہی باتیں)

قومیں اور معاشرے دنیا سے الگ تھلگ رہ کر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتے۔ دنیا جب عالمی گاؤں کی صورت اختیار کر لے پھر تو یہ مشکل تر ہو جاتا ہے۔ تبسم کاشمیری بین الاقوامی ضرورتوں اور ارضی حالات سے بخوبی آگاہ ہیں نظموں میں اس طرف توجہ مبذول کروائی گئی ہے۔

فرد کی آدرش اور آرزو کی ترجمانی شاعر کے ہاں مقصدیت کا درجہ رکھتی ہے۔ عام آدمی جس کے عزائم اور ارادے کبھی الفاظ کا روپ نہیں دھار سکتے، ان کی آہیں اور سسکیاں تبسم کے شعر میں ڈھل گئے ہیں۔ ان کے آہنگ میں گندھی معنوی گتھیاں زمین و زماں و مکاں سے ماورا نظر آتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر، المیہ تاریخ، حیدرآباد سندھ، آگہی پبلی کیشنز۔ ۱۹۸۵ء، ص:۱۹
۲۔ عابد علی عابد، سید، البیان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص:۶
۳۔ آزاد، محمد حسین، دربار اکبری، لاہور، نگارشات ۱۹۹۸ء، ص:۷۱
۴۔ صلاح الدین درویش، ڈاکٹر، تنقید اور بیانیہ، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء، ص:۲۰۶
۵۔ محمد تقی، سید، ہندوستان پسِ منظر و پیش منظر، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۳ء، ص:۱۲